ھو
۱۲۱

عرفان اور تصوف سے آشنائی

☆☆ از ☆☆

الحاج ڈاکٹر نور علی تابندہ مجذوب علی شاہ

هو

۱۲۱

یہ مقدس دستورات اور فرمائشات۔

قطبُ العارفین حضرت آقا الحاج ڈاکٹر

نورعلی تابندہ مجذوب علی شاہ۔ قطبِ سلسلہ نعمت اللہی سلطان علی شاہی ۔ کے ارشادات ہیں۔ اُنہی کی اجازت اور رحمت سے یہ دستورات اور فرمائشات فارسی زبان سے اردو زبان میں ترجمہ کئے گئے ہیں۔ اس ترجمہ کا حاصل یہ جو فقراء اور دیگر مومنین فارسی زبان نہیں جانتے ہوں وہ بھی ان دستورات کو سمجھ کر اُن پر عمل کرتے ہوئے اُن سے فیض پا سکیں۔ یہ ترجمہ کرتے وقت اس بات کے لئے کافی احتیاط برتی گئی کہ معنی حرف بہ حرف درست اور آسان اور شیریں اردو زبان میں ہو۔ تاکہ مومنین اکرام کو پڑھنے میں آسانی ہو۔ انشاء اللہ۔ مولائے فقراء اس ترجمہ کو قبول فرمائیں اور اپنی رحمتوں سے نوازے۔ آمین

حیدرآباد۔ دکن ' انڈیا۔

تاریخ : ۱۷/صفر ۱۴۲۳ھ مطابق یکم مئی ۲۰۰۲ء

تشیع، تصوف اور عرفان(۱)

" رَبِّ اشْرَحْ لِی صَدْرِی وَیَسِّرْلِی اَمْرِی وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِن لِسانِی یَفْقَهو قَوْلِی (۲) تشیع اور تصوف (یہ دونوں لفظ ایک حقیقت کے لئے ہیں) کے بارے میں تحقیق کرنے والے ' خاص طور پر ' یوروپی محققین نے بڑی غلطیاں کی ہیں۔ پتہ نہیں یہ غلطیاں جان بوجھ کر کی گئی ہیں یا نادانستہ ہوگئی ہیں؟ ان میں سے بعض لوگوں کی نیت تھی کہ تشیّع میں فساد اور اسلام میں تفرقہ پیدا کیا جائے اسی طرح استعماریت کے ہتھکنڈوں سے آگاہ کرنے کی کوشش میں خلوصِ نیت کے باوجود کچھ لوگ ایسے نتیجوں پر پہنچے جنکا صحیح ہونا مشکوک ہے چنانچہ اس کا بھی بعض لوگوں نے غلط فائدہ اُٹھایا۔

سب سے پہلی غلطی اپنی خود ساختہ اصطلاح کے بموجب ان لوگوں سے تشیع کی تاریخ پیدائش میں ہوئی۔ بعض کہتے ہیں کہ تشیع حضرت علیؑ کی وفات کے بعد وجود میں آیا۔ کچھ کہتے ہیں امام حسنؑ کی شہادت کے بعد۔ اسی طرح اس

---

۱) ملاحظہ ہو "عرفان ایران" شمارہ۔ ۷۔ تہران ۱۳۷۹۔ صفحہ ۱۱ تا ۲۴۔
کسی نے مدیر سے سوال پوچھا کہ تشیع 'تصوف اور عرفان میں کیا ربط ہے۔ زیرنظر کتاب کے مولف نے اسکا جواب نہایت واضح اور آسان زبان میں سوال کی مناسبت سے دیا جو "عرفان ایران" میں شائع ہو چکا ہے۔

۲) سورہ طٰہٰ آیت۔ ۸ تا ۲۵۔ "اے میرے پروردگار میرا سینہ کشادہ کردے 'میرا کام آسان کردے ' میری زبان کی گرہ کھول دے تاکہ (وہ لوگ) میری بات سمجھیں"۔

بارے میں کچھ اور نظریات بھی ہیں۔ غلطی یہ ہوئی کہ وہ اسم کی پیدائش کو مُسمّیٰ کی پیدائش سمجھ بیٹھے حالانکہ اسم کی پیدائش اور اسکا رواج ہر وقت ممکن ہے اور اس سے اصل معاملے میں کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ بعض دفعہ بنیاد ہو یا نہ ہو مکتب خود لفظ کو وجود میں لے آتا ہے۔ تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہو گا کہ شیعوں کو کبھی "شیعان علیؑ" کہا جاتا تھا۔ ایک عرصے تک "شعوبی" اس لئے کہا جاتا تھا کہ وہ اپنے آپ کو قرآن کی اس آیت سے منسوب کرتے تھے جس میں خدا نے فرمایا ہے۔

" یاایھاالناسُ اِنّاخلَقناکم مِنْ ذکرٍ واُنثیٰ وجَعلنا کُم شُعُوباً و قبائِلَ لِتعارَفوا اِنّ اکرَمَکُم عِند اللّٰہِ اَتقٰیکُم ۔ " (۱)

غیر عرب مسلمان ہوتے وقت یہ توقع رکھتے تھے کہ ان میں اور عربوں میں کوئی امتیاز نہیں کیا جائے گا مگر دُکھ کی بات یہ ہے کہ حضرت علیؑ اور امام حسنؑ کے زمانہ خلافت کو چھوڑ کر دوسرے خلفا کے عہد میں یہ امتیاز روا رکھا گیا اسی بناء پر اسکے خلاف شیعہ مذکور بالا آیت سے دلیل پیش کرتے تھے۔ ایک زمانے میں شیعوں کو "رافضی" کہتے تھے یعنی وہ لوگ جنہوں نے دین ترک کر دیا۔ اسی طرح شیعوں کو مختلف نام دئے گئے۔ نام کی پیدائش اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ مُسمّیٰ کا وجود نہ ہو۔ اسکے لئے ہمیں یہ دیکھنا ہو گا کہ اسلام میں آخر تشیّع اور تسنّن کے درمیان فرق کیا ہے ؟ اور

۱) سورہ حجرات۔ آیت۔ ۱۳
"اے لوگو ہم نے تمہیں مرد اور عورت سے پیدا کیا اور تم میں سے قومیں اور قبیلے بنائے تاکہ تم پہچانے جاسکو۔ تم میں سے خدا کے نزدیک سب سے زیادہ گرامی وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہو۔"

ان دونوں کے اصول کیا ہیں ؟ ان اصولوں سے معلوم ہو گا کہ اسلام میں آخر تشیّع کب وجود میں آیا۔

پیغمبرؐ کی وفات کے بعد جب علیؑ اور انکے چچا عباسؓ بلکہ سارا خاندان بنی ہاشم حضورؐ کی تدفین کے انتظامات میں مصروف تھا کچھ لوگ محلّہ "سقیفہ بنی ساعدہ" میں جمع ہوئے اور جیسا کہ تاریخ میں ہے انہوں نے ابو بکر کو پہلا خلیفہ چُن لیا۔ ابو بکر کے بعد عمر، عثمان اور چوتھے مرحلے میں علی علیہ السلام خلیفہ ہوئے۔

پیغمبر کی وفات کے بعد جو لوگ سقیفہ بنی ساعدہ میں کئے گئے فیصلے کے خلاف تھے اُن کا کہنا تھا کہ جس طرح پیغمبر کا انتخاب لوگوں نے نہیں کیا بلکہ خدا نے کیا بالکل اسی طرح پیغمبر کے جانشین کا انتخاب بھی لوگ نہیں کر سکتے۔ اسکا حق لوگوں کو نہیں یہ تو خدا کی مرضی کے مطابق ہونا چاہئیے۔ ہمارے پیغمبر آخری ہیں۔ آئیندہ وحی کا سلسلہ بند رہے گا اور پیغمبر کی ہی ہر بات کو وحی کا درجہ حاصل ہے جسکی جانب سورہ نجم میں صراحت موجود ہے کہ **"ماینطِقُ عَنِ الھَویٰ اِنْ ھُوَالاَّ وَحیٌ یوحیٰ "**(۱) اسی بناء پر یہ کہا جائے گا کہ پیغمبر نے جسے مقرر کیا وہ دراصل خدا کا مقرر کیا ہوا ہے اور یہ بات ظاہر ہے کہ پیغمبر نے کئی بار اپنی رسالت کے دوران علیؑ کو اپنا جانشین قرار دیدیا تھا اس لئے پیغمبر کے جانشین علی ہیں نہ کہ وہ جسے لوگوں نے چُنا ہو۔ اسکے بر خلاف اہل سُنّت جو سقیفے کے فیصلے کو مانتے ہیں،

۱) آیت نمبر ۳۔ ۴۔ "وہ جو کچھ کہتے ہیں ھویٰ نہیں بلکہ وحی ہے جو ان پر کی گئی "

کہتے ہیں کہ جب لوگوں نے جمع ہو کر خلیفہ کا انتخاب کیا تو یہ انتخاب معتبر تھا اور جسے چُنا گیا اسے خلیفہ مانا جائے گا۔ (اس قول پر اعتراض کیا جاسکتا ہے کیونکہ سبھی لوگ یا فیصلے کا حق رکھنے والے تمام بزرگ موجود نہ تھے)

تاریخ بتاتی ہے کہ پیغمبر کے بعد یکے بعد دیگرے ابوبکر، عمر، عثمان، علی، اور امام حسنؑ خلیفہ ہوئے۔ گو اس تاریخی حقیقت کی تردید نہیں کی جاسکتی مگر شیعہ کہتے ہیں کہ پیغمبر کی معنوی خلافت علیؑ کا حق تھا یہیں سے اختلافات شروع ہوئے۔ ابوبکر، عمر اور عثمان کو ماننے والے سُنّی کہلائے اور علی اور امام حسن کی پیروی کرنے والے شیعہ۔ اس اختلاف کی بنیاد یہ ہے کہ سُنّیوں کے نزدیک لوگ اپنا خلیفہ چُن سکتے ہیں اور شیعہ کہتے ہیں کہ خلافت کے بارے میں فیصلہ پیغمبر کے حکم اور فرمان کے مطابق ہونا چاہیئے۔

ظاہر ہے کہ پیغمبر کے بعد علی کا تعین ہوا کیونکہ زمین پر ہمیشہ اللہ کے نمائندہ کا ہونا لازمی ہے۔ علیؑ کے بعد خلیفہ وہ ہے جسکو علیؑ نے مقرر کیا ہو۔ یہ سلسلہ آخر تک رہے گا۔ جب ہم اس اختلاف کو دیکھتے ہیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ شیعہ مذہب کی بنیاد پیغمبر کی رحلت کے ساتھ ہی ظاہر ہوگئی تھی۔ یہ کہنا غلط ہوگا کہ شیعہ مذہب وجود میں آیا۔ وجود میں نہیں آیا بلکہ ظاہر ہوا۔ پیغمبر کی زندگی میں بھی یہ اختلاف تھا مگر ظاہر نہ ہوا تھا یا اختلاف نہ تھا کیونکہ ابھی اسکا سبب ظاہر نہ ہوا تھا۔ جیسے ہی پیغمبر کا انتقال ہوا یہ اختلاف ظاہر ہوگیا۔ ثابت ہوا کہ پیغمبر کی رحلت کے ساتھ ہی تشیع ظہور میں آگیا۔ جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا تشیع اور تسنّن میں دوسری

باتیں اور نظریات اس طرح شامل ہوتے گئے کہ دونوں اصولوں اور نظریوں کا مجموعہ بن گئے البتہ تشیع کی بنیاد وہی ہے اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہر وہ شاعر، ادیب، عارف اور عالم جو علیؑ کی ولایت کا معتقد ہے، یعنی یہ کہ علیؑ بلا فصل پیغمبر کے حقیقی جانشین ہیں اور خلافت انکا حق تھا وہ شیعہ ہے۔ اس نکتے کے پیش نظر سعدی، حافظ مولوی اور اصولاً تمام اہل عرفان شیعہ کہلائینگے۔

ان لوگوں کے یہاں جو فقہی اختلاف پایا جاتا ہے اسکا تعلق اصلی مکتب یعنی بنیادی عقائد سے نہیں۔ شیعہ فقہاء میں بھی اس قسم کا اختلاف پایا جاتا ہے۔ اسی طرح سنی اور شیعہ فقہا میں اختلاف ہے البتہ بنیادی اصول یہی ہے کہ جو کوئی علیؑ اور انکے جانشینوں کی ولایت کا معتقد ہوگا شیعہ کہلائیگا۔ بہر حال تشیع پیغمبر کی رحلت کے ساتھ ہی ظاہر ہوا مگر اسکی تعلیمات پہلے سے ہی موجود تھیں چونکہ ان تعلیمات کا کوئی مخالف نہ تھا لہذا اس وقت تشیع کے ظہور میں آنے کی ضرورت نہ تھی مگر غیر مسلم خارجی محقق جب تحقیق شروع کرتے ہیں تو وہ مکتب کے بنیادی اصولوں کو نظر انداز کرتے ہوئے مکتب کی خارجی حیثیت پر زور دیتے ہیں۔ مثلاً یہ دیکھنے کے بعد کہ علیؑ نے قوانین نافذ کرنے کے سلسلے میں خلفاء کی مدد کی وہ اس زمانے سے تشیع کی ابتداء نہیں کرتے بلکہ اس وقت سے کرتے ہیں جبکہ اختلاف اجتماعی طور پر ظاہر ہو چکا تھا۔ یہ غلطی کچھ مسلمان محققین سے بھی ہوئی ہے جو قرون اولیٰ کے مسلمانوں کے روحانی اصولوں سے واقفیت نہیں رکھتے تھے۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ شیعوں اور سنیوں میں شدید بنیادی اختلاف یہ تھا کہ شیعوں کے

یہاں رہبر کا تعین ہوتا ہے اور سنیوں کا یہاں اُسکا انتخاب کیا جاتا ہے۔ خلفاء نے ہمیشہ یہی کوشش کی کہ شیعی نظریات کا خاتمہ ہو جائے انہوں نے اس مکتب فکر کے ماننے والوں کو اذیتیں بھی دیں جسکی بناء پر شیعوں کو نہ صرف ائمہ کی زندگیوں کے دوران بلکہ ان کے بعد بھی تقیہ کرنا پڑا اس سلسلے میں کئی داستانیں ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ہارون رشید کا وزیر علی بن یقطین بھی تقیہ کرتا تھا۔

شیعوں کی ایک بڑی تعداد اپنے افکار و عقائد کو صحیح طریقے سے تشکیل کرنے کے لئے اور مومنین کو اسکی تعلیم دینے کے لئے گوشہ نشین ہو گئی کہ کوئی ان کو پہچان نہ سکے۔ یہی وہ لوگ تھے جو تاریخ اسلام میں "صوفی" کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ رفتہ رفتہ "تصوف" کی اصطلاح رائج ہو گئی یہ بحث کہ "تصوف" کی اصل کیا ہے اور وہ کس لفظ سے نکلا ہے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا اس بارے میں کہا جاتا ہے اور سند بھی دیجاتی ہے کہ اسکی اصل "صوف" یعنی اُون ہے اور تصوف کے معنی اونی لباس پہننا ہے صوفیا عمداً اونی لباس پہنتے تھے بیان کیا جاتا ہے کہ انبیاء بھی اونی کپڑے پہنتے تھے۔ اونی لباس کھردرا اور سخت ہوتا تھا اس میں جسم کو تکلیف ہوتی تھی اس میں انسان آرام سے زیادہ دیر سو نہیں سکتا تھا تاکہ بیدار رہکر عبادت میں مصروف رہے تذکرۃ الاولیاء (۱) میں ایک حکایت ہے کہ کسی نے (غالباً سفیان ثوری) حضرت جعفر صادق علیہ السلام کو نفیس ترین نرم لباس میں دیکھا۔ (اماموں کے طرز زندگی میں کافی فرق تھا۔ حضرت جعفر صادق یا امام حسن کا

۱) تذکرۃ الاولیاء۔ از۔ شیخ فریدالدین عطار۔ تصحیح۔ ڈاکٹر محمد استعلامی تھران۔ ۱۳۶۳۔ ص۔ ۱۵

امیرانہ طرز زندگی علیؑ سے جداگانہ تھا۔ اس میں جو حکمت پوشیدہ تھی اسکا ذکر ہم یہاں نہیں کرینگے۔ آئندہ اسکا بیان کیا جائے گا) وہ حضرت جعفر کی خدمت میں آئے اور سلام کے بعد کہنے لگے۔ یابن رسول اللہ ایسا ملائم فاخرانہ لباس فرزندِ رسولؐ کو زیب نہیں دیتا۔ حضرت نے انکا ہاتھ پکڑ کر اپنی آستین کے اندر داخل کر دیا تو اُنہیں محسوس ہوا کہ سخت کھردرا اونی لباس وہ اندر پہنے ہوئے ہیں۔ حضرت نے فرمایا یہ حق کے لئے اور وہ خلق کے لئے ہے۔ یعنی اونی لباس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ حق کے لئے اور فاخرانہ لباس خلق کے لئے ہے اگر ہم اس حکایت کو نہ مانیں تب بھی عطارؒ کی اس تحریر کا مقصد یہ ظاہر کرنا ہے کہ بزرگان تصوف جنکے سردار حضرت جعفر صادقؑ رہے ہیں سخت اونی لباس کو عبادت اور اسکے لئے آمادگی کے لئے ضروری سمجھتے تھے۔

ہر لحاظ سے تصوف کی اصل "صوف" سے ہی زیادہ مناسبت رکھتی ہے اور اہل تشیع کے لئے یہ جداگانہ نام مشہور ہو گیا جو آج تک رائج ہے۔ آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ کسی ایسے ملک میں جو اسلام مخالف ہے۔ وہاں ایک اسلامی پارٹی کو ختم کر دیا جاتا ہے اور اسکا نام تک مٹا دیا جاتا ہے وہی پارٹی کسی اور نام سے دوبارہ خود کو منظم کر کے اپنی سرگرمیاں ایک مدت تک جاری رکھتی ہے تشیع کی بھی صورت حال یہی رہی ہے اس نے بھی تاریخ اسلام میں خود کو دوسرے نام "صوفی" سے سرگرم عمل بنالیا۔

تصوف کی بنیاد پہلے دن سے ہی اس عقیدے پر قائم ہے کہ علیؑ کے

سوا کوئی اور پیغمبر کا جانشین نہیں۔ علیؑ تمام صحابہ سے افضل ہیں البتہ عمل کے طریقہ جدا جدا رہے ہیں۔ شیعوں کا عقیدہ ہے کہ ہر زمانے کے تقاضے الگ الگ ہوتے ہیں مثلاً حضرت علیؑ کا طرز زندگی انتہائی سادہ اور فقیرانہ تھا اپنی محنت کی کمائی سے خریدے ہوئے کھجور کے کئی باغات انکی ملکیت تھے مگر انہوں نے سب کو وقف کر دیا۔ ان باغات کی آمدنی سے کبھی استفادہ نہیں کیا۔ حضرت جعفر صادقؑ شان و شوکت سے زندگی بسر کرتے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام زمانہ کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق زندگی گزارنے کا فیصلہ کریں۔

تاریخ بتاتی ہے کہ تصوف کبھی زہد کبھی گوشہ نشینی کی صورت میں سامنے آیا اور کچھ لوگوں کے مطابق کبھی اجتماعی جدوجہد کی صورت میں ظاہر ہوا۔ بہر حال یہ مختلف زمانوں میں مختلف انداز سے نمودار ہوتا رہا ہے مگر ان میں سے کسی کو حقیقی تصوف سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔ تصوف کی بنیاد تو فقط مسئلہ وصایت اور ولایت ہے باقی تمام باتیں اضافی ہیں جو آہستہ آہستہ ہر زمانے کے تقاضوں کے تحت اس میں داخل ہوتی گئیں۔ جو غلط فہمی تشیع اور لفظ تشیع کے بارے میں پائی جاتی ہے وہ تصوف میں بھی ہے کچھ لوگ کہتے ہیں یہ پہلی مرتبہ دوسری صدی کے دوران وجود میں آیا۔ اسکے بارے میں ہر شخص اپنا اپنا نظریہ پیش کرتا ہے جبکہ حقیقت صرف اتنی ہے کہ تصوف تشیع کی روح اور اسکا مفہوم ہے۔

تاریخ تشیع کو دیکھا جائے تو ایک گروہ ایسا نظر آئیگا جسکی توجہ زیادہ تر

فقہی احکام کی طرف رہی ہے انہوں نے فقہی نظریات بیان کئے ہیں دوسرے گروہ نے اعتقادی مسائل اور عرفان الٰہی کو زیادہ اہمیت دی کیونکہ انکے پیش نظر تصوف تھا۔ حقیقت میں یہ دونوں اصطلاحیں ایسی ہی ہیں جیسے ایک جسم کے دو بازو۔ اکثر ایسا ہوتا رہا ہے کہ کچھ لوگ حقیقت پر گہرائی سے غور کئے بغیر سمجھ بیٹھتے ہیں کہ ان دونوں کے درمیان اختلاف تھا۔

اکثر مغربی محققین نے اس بات کو اس لئے ہوا دی کہ اس میں انکا اپنا مفاد تھا۔ دراصل تشیع اسلام کی روح اور بنیاد ہے۔ تشیع کی روح تصوف ہے۔ تصوف کے بغیر تشیع ممکن نہیں اور تشیع کے بغیر تصوف کا تصور محال ہے۔

اس سلسلے میں محققین ایک اور پہلو بھی سامنے لے آتے ہیں جسکا مقصد تفرقہ انگیزی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ خدا ہی جانتا ہے کہ ایسے مسائل وہ جان بوجھ کر پیدا کرتے ہیں یا نادانستہ! بہر حال حقیقت جو کچھ بھی ہو انکا دعوی ہے کہ تصوف دراصل اسلام اور تشیع کی بنیاد کو نقصان پہنچانے کے لئے وجود میں آیا تھا۔ اس سلسلے میں وہ چند نامور صوفیوں کی مثال پیش کرتے ہیں اور ایسے متصوفین سے استناد کرتے ہیں جنکی توجہ زیادہ تر معنوی مسائل کی طرف نہ تھی یا جنکا رشتہ حقیقی بنیاد سے ٹوٹ چکا تھا۔ لوگوں کو رشد و ہدایت دینے کا کام صرف وہی کر سکتے ہیں جنہیں انکے پیر و مرشد کی جانب سے متعین کیا گیا ہو۔ سب معتقد ہیں کہ اجازت کا یہ سلسلہ قیامت تک رہے گا۔ شیعہ اثناء عشری فرقے کا عقیدہ ہے کہ غیبت امام کے زمانے میں جو کوئی اس کام کے لئے مقرر کیا جاتا ہے صرف اسی کو حق حاصل ہے کہ وہ مومنین سے بیعت لے اور اپنا جانشین مقرر کرے تاکہ سلسلہ قائم رہے۔ جسکو ملی ہوئی اجازت کا سلسلہ دست بہ دست امام تک پہنچتا ہے اسکا رشد و ہدایت کرنا شرعی اور قانونی ہے ورنہ یہی سمجھا جائے گا کہ ان کا سلسلہ امام سے ٹوٹ چکا ہے۔

ایسے لوگ جنکا رشتہ امام سے منقطع ہو چکا تھا انہوں نے اپنے ذاتی نظریات کے زیر اثر جو مسائل تصوف کے نام سے بیان کئے ہیں ان کا تصوف سے کوئی تعلق نہیں۔

بہت کم محققین نے اسطرف توجہ کی ہے۔ حال میں الکزنڈر بیگنن 'اندرس اور یموش نے ایک کتاب تالیف کی ہے جسکا فارسی میں ترجمہ ہو چکا ہے (۱) عنوان ہے ''سوویت یونین میں تصوف پر تحقیق'' اس کتاب کے مولفین لکھتے ہیں کہ ''تصوف نہ کوئی فرقہ ہے نہ رافضیوں یا اعتزالیوں کی تحریک 'بلکہ یہ حقیقی اسلام کا ایک ایسا حصہ ہے جسے اس سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ مگر تجزیہ کرنے والے یوروپی محققین نے اس حقیقت سے اپنی آنکھیں بند کرلی ہیں۔ وہ بار بار یہی دعوا کرتے ہیں کہ تصوف اسلام میں پیدا ہونے والی ایک ایسی عجیب صورت حال تھی جو سراسر اسلام کے خلاف تھی۔''

سابقہ سوویت یونین کی حکومت حالانکہ مذہب بیزار تھی اسکے باوجود یہ ایسے محققین ہیں جو سوویت یونین میں تصوف کے موضوع پر مطالعہ کر کے اس نتیجہ پر پہنچے ہیں

مغربی محققین کی دوسری بحث جو اس سلسلے میں سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ تشیع اور کچھ لوگوں کے مطابق تصوف ایک جنگی تحریک تھی جو ایران پر عربوں کے قبضے کے خلاف پیدا ہوئی تھی کیونکہ عربوں نے ایرانی بادشاہوں کی حکومت کا خاتمہ کر کے ملک پر قبضہ کر لیا تھا لہذا اسکے ردّ عمل کے طور پر اہل تصوف نے ہتھیار اُٹھالئے اور ملک کو بیگانوں سے نجات دلائی۔ یہاں ہم ایک بات

(۱) صوفیان وکمیسر ها: تصوف در اتحاد شوروی 'ترجمہ افسانہ منفرد۔ تہران۔ ۱۳۷۸۔ صفحہ ۲۱۴

صاف کردیں اور وہ یہ ہے کہ ایران عربوں نے نہیں بلکہ اسلام نے فتح کیا تھا۔ جب اسلامی فوجیں ایران میں داخل ہوئیں اور جنگ کے بعد غالب ہو گئیں تو لوگ مسلمان ہو گئے اور انہوں نے خلوص قلب سے اسلام قبول کر لیا اس امر کو سمجھنے کے لئے مندرجہ ذیل دو واقعات پر غور کرنا ضروری ہے۔

کہا جاتا ہے کہ نوشیروان نے تاجروں کو بلا کر اُن سے درخواست کی کہ وہ جنگی اخراجات کے لئے قرض دیں یہ بات سن کر ایک موچی نے پیشکش کی کہ میں اکیلا پورا خرچ بطور قرض نہیں بلکہ تحفتاً دینے کے لئے تیار ہوں مگر شرط یہ ہے کہ میرے بیٹے کو لکھنے پڑھنے کی اجازت دیدی جائے۔ نوشیروان کو غصہ آگیا اُس نے پیشکش ٹھکرادی اور موچی کے بیٹے کو لکھنے پڑھنے کی اجازت دینے سے انکار کردیا۔

اسلام کہتا ہے'' **طَلَبُ العِلم فَریضة علی کُلَ مُسلم** ''(۱)

جنگ بدر کے قیدیوں کو رقم دے کر چھڑوانے کے لئے جب انکے رشتے دار آئے تو حضور نے فرمایا کہ جو قیدی سات لوگوں کو لکھنا پڑھنا سکھائے گا اسے آزاد کر دیا جائے گا۔

ان دونوں واقعات کا جائزہ لیجئے۔ معنوی پہلو کے بجائے صرف ظاہری پہلو پر نظر ڈالیئے۔ دو لشکر آمنے سامنے ہیں ایک نوشیروانی فکر اور دوسرا

۱) یادرہے کہ اس حدیث میں ''مسلمة'' کے لفظ کا اضافہ کردیا گیا کہ کہیں حدیث ادھوری نہ رہجائے۔ حالانکہ ''علی کل مسلم'' کافی ہے جب بھی مسلم کہا جائے گا اُس میں مرد عورت دونوں شامل ہونگے۔

اسلامی فکر کا حامل ہے۔ بتایئے ان دونوں میں سے کونسا لشکر فتح حاصل کرے گا؟

بہر حال اسلام نے فتح حاصل کی۔ (ایرانی ہمیشہ اسلام اور مسلمانوں کے خیر خواہ رہے۔ ایران میں جو بھی انقلاب آئے۔ مثلاً وہ لڑائیاں جو بیگانوں کے تسلط اور اسلام کی حفاظت کے لئے لڑی گئیں جیسے کہ ابو مسلم خراسانی سربداروں اور صوفیوں کی جنگ۔ ان میں سے سربداروں اور صوفیوں کا تعلق صوفیوں سے تھا۔ اسی طرح کچھ اور تحریکیں بھی تھیں مگر جن لوگوں نے صرف ایران کی آزادی اور در حقیقت اسلام کے خلاف لڑائی کی وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ مثلاً ہاشم بن حکیم (جو المقنع کے نام سے مشہور تھا) مازیار' بابک' افشیں وغیرہ یہی وجہ ہے کہ ایسے لوگ اور تحریکیں بہت جلد ختم ہو گئیں۔ یہاں تک کہ ان کے نظریات بھی فنا ہو گئے۔ مغربی محققین اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ انکا کہنا ہے کہ تصوف اور تشیع دراصل ایرانیوں کی ایسی تحریکیں تھیں جو عربوں کے خلاف بطور اسلحہ استعمال کی گئیں۔ یہ صحیح نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تصوف سراسر تشیع ہے اور تشیع عین اسلام ہے۔ اسکا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ صفویوں کی لڑائی کی بناء پر ایران میں تشیع کو غلبہ حاصل ہو گیا۔

دوسری بات جس سے غلط فہمی پیدا ہوئی وہ یہ بیان ہے کہ "تصوف اور عرفان" دو الگ الگ موضوع ہیں؟ یہ صحیح ہے کہ لغوی حیثیت سے یہ دونوں جدا جدا ہیں مگر "عباراتنا شتّٰی و حُسنك واحدٌ"

یہ غلط فہمی بہت قدیم زمانے سے چلی آتی ہے۔ یہاں تک کے تصوف کے مخالفین جنہوں نے تصوف کے خلاف کتابیں لکھی ہیں عرفان کی تعریف کرتے ہیں۔ کچھ دانشور تصوف اور عرفان کو ایک سمجھتے ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے۔

آیئے دیکھیں کہ مختصراً عرفان کیا ہے؟ اسکے لغوی معنی شناخت اور پہچان کے ہیں۔ شناخت کے بھی کئی درجے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ نے فطرتاً خود ہی یہ حقیقت پہچان لی تھی کہ اس کائنات کا ایک خدا ہے جو سب پر مسلط ہے یہ انکا عرفان تھا۔ جب انہوں نے ستارا دیکھا تو کہا "یہ میرا خدا ہے" وہ نورانی تارا شعرای یمانی تھا۔ جب وہ غروب ہو گیا تو کہنے لگے "لااحب الآفلین" (۱) "جو چیز غروب ہو جائے میں اسے پسند نہیں کرتا" چودھویں کا چاند دیکھا تو کہنے لگے "یہ میرا خدا ہے" جب وہ غروب ہوا تو غور کر کے کہا "یہ بھی غروب ہو گیا"۔ تو بول اُٹھے۔

"انی وَجَّهْتُ وَجهِیَ لِلَذی فطَرالسَّموات وَالاَرضَ" (۲)

"میں اپنا رخ اسکی طرف کرتا ہوں جو آسمان اور زمین کا خالق ہے۔"

اس وقت تک انہیں یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آگئی تھی کہ وہ پروردگار جسکی انہیں تلاش ہے نہ جسم رکھتا ہے نہ جسمیت بلکہ وہ ہے جس نے آسمانوں چاند' سورج اور ستاروں کو پیدا کیا ہے۔ یہ سب عرفانی درجات ہیں اور سادہ

(۱) اور (۲) سورۂ انعام۔ آیت ۷۶۔۷۹

ترین عرفانی درجہ وہ تھا جس میں حضرت یہ نہیں سمجھ سکے تھے کہ جس خدا نے انہیں پیدا کیا وہ جسم رکھتا ہے یا نہیں۔ آہستہ آہستہ وہ اس مقام عرفان پر پہنچ گئے جسکے بارے میں خدا فرماتا ہے کہ۔

" کذالك نُرِی ابراہیمَ مَلکوتَ السَمٰواتِ والارضِ۔ "(۱)

" ہم نے اس طرح آسمانوں اور زمین کے ملکوت انہیں دکھادئے۔"

اس انداز سے جو خدا کو پہچان لے اور یہ جان لے کہ خدا ہے وہ عرفان کا ایک درجہ حاصل کر لیتا ہے۔ عرفان امر مطلق نہیں ہے بلکہ فلسفیوں کے قول کے مطابق ایسے درجات رکھتا ہے جس میں تشکیک یعنی شک بھی پایا جاتا ہے۔ جیسے نور اور ایمان' کہ یہ دونوں درجات رکھتے ہیں۔ چھوٹے درجے سے شروع ہوتے ہیں اور اگر خدا توفیق دے تو انتہائی اونچے درجوں تک رسائی ہو جاتی ہے اس مثال پر غور کیجئے۔ کوئی شخص ایک بیابان میں ہے جہاں دور دور تک آبادی کے آثار نہیں صاف ہوا میں (یہاں صاف ہوا سے مراد اس شخص کی انتہائی خالص نیت ہے) اُسے دور ایک سیاہ نقطہ نظر آتا ہے۔ وہ صرف اتنا جانتا ہے کہ ایک سیاہی ہے۔ اسکی سمجھ میں صرف اس قدر آتا ہے کہ وہاں کوئی جسم ہے۔ کسی قدر آگے بڑھنے پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک سیدھی لمبی لکیر ہے۔ اس وقت اسکی سمجھ میں آتا ہے یعنی اسے عرفان ہوتا ہے کہ وہ جسم لمبا ہے۔ کچھ اور آگے بڑھنے پر اُسے پتوں جیسی کوئی چیز

(۱) سورہ انعام آیت۔ ۷۵

شاخوں پر دکھائی دیتی ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس درخت میں پتے ہیں یعنی وہ ہرا بھرا ہے۔ پھر دیکھتا ہے کہ اس درخت میں حرکت ہو رہی ہے اور وہ ہل رہا ہے۔ وہ سمجھ جاتا ہے کہ ہوا اس سے ٹکرا رہی ہے۔ کچھ اور آگے بڑھنے پر نظر آتا ہے کہ کچھ چیزیں اس درخت سے لٹک رہی ہیں۔ اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ کسی پھل کا درخت ہے۔ آگے بڑھنے پر پتہ چلتا ہے کہ وہ یا تو سیب کا درخت ہے یا کسی اور چیز کا۔ اسطرح عرفان حاصل کرتا ہے پھر اس درخت کے پاس پہنچ کر چکھتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ اسکا پھل میٹھا ہے۔

بالکل اسی قسم کے عرفانی درجات سے انسان خداشناسی کے سفر میں گزرتا ہے۔ خدا کے عرفان اور اسکی پہچان کا طریقہ ایسا ہی ہے۔ اسی لئے عرفان حاصل کرنے والے کو عارف کہا جاتا ہے۔ یہ کوئی ایسا امر نہیں جس سے لوگ بالکل ناواقف ہوں اور عارف ہی سب کچھ جانتا ہو۔ عارف کے بھی درجات ہوتے ہیں۔ جیسے عارف اور اس سے بڑھکر اعرف۔ راہ عرفان پر چلنے سے جو کامل عرفان حاصل ہوتا ہے اُسے تصوف کہتے ہیں۔ یعنی تصوف عرفان حاصل کرنے کا عملی راستہ ہے۔ تصوف اور عرفان دو ایسے لفظ ہیں جنکا مطلب ایک ہی ہے گویا یہ ایک سکے کے دو رُخ ہیں۔ یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ ایک راستے کی اور دوسرا منزل کی نشاندہی کرتا ہے۔ ہر طرح سے یہ دو بھی ہیں اور واحد بھی ۔ آج کل ایران میں جو اختلاف تصوف اور عرفان کے درمیان پایا جاتا ہے اسکی وجوہات شائد سیاسی ہیں اسکی وجہ سے عرفان کو برا نہیں کہا جاسکتا۔ کیونکہ کئی بزرگوں نے اسکی تعریف کی ہے اور

اسے قبول عام حاصل ہے۔ یہ لوگ تصوف اس لئے قبول نہیں کر سکتے کہ کہیں انکی دنیوی زندگی خراب نہ ہو جائے۔ اسی لئے کہتے ہیں عرفان تصوف سے جدا ہے۔ وہ لوگ بھی جو مسلک تصوف کے پیرو تھے انہوں نے مخالف ہو کر اسکی تردید میں کتابیں لکھ ڈالیں۔ یہ لوگ اپنی مخالفت میں شدت پیدا کرنے کے لئے اپنی گذشتہ زندگی پر لعنت بھیجتے ہیں۔ کہتے ہیں عرفان خوب ہے اسکا تصوف سے کوئی تعلق نہیں بلکہ یہاں تک کہہ جاتے ہیں کہ اس سلسلے میں قدیم بزرگوں سے غلطی ہوئی ہے جو وہ ان دونوں کو ایک سمجھ بیٹھے تاکہ یہ ظاہر ہو کہ ان سے پہلے کے بزرگوں نے بھی یہ حقائق بیان کئے ہیں

بیعت کا مطلب (۱)

بیعت کے لغوی معنی خرید و فروخت ہے۔ یہ لفظ "بیع" سے نکلا ہے۔ یعنی ایک خاص قسم کی خرید و فروخت۔ سورۂ توبہ کی آیت نمبر ۱۱۱ میں خاص طور پر بیعت کا ذکر ہے۔ اللہ فرماتا ہے "**اِنَّ اللّٰہ اشْتَرٰی مِنَ الْمُومنینَ اَنْفُسَھُمْ وَاَموالَھُمْ بِاَنَّ لَھُم الْجَنَّۃَ** ۔" خدا مومنوں کی جان و مال خریدتا ہے اور اس کا بدلہ جنت ہے۔" اس سودے اور وعدے کو تجارت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ مثلاً سورۂ صف میں اللہ فرماتا ہے۔(۲) **یا اَیُّھَا الَّذینَ آمَنُوا ھَلْ اَدُلُّکُمْ عَلٰی تِجارَۃٍ تُنجیکُمْ مِنْ عَذابٍ اَلیمٍ تُومِنُونَ**

(۱) ملاحظہ ہو "عرفان ایران" شمارہ ۱۔ ۸ ۷ ۱۳۔ صفحہ ۷ تا ۱۵
(۲) آیات۔ ۱۰ اور ۱۱

بِاللّٰہِ وَرَسُولِہ وَتُجاھِدُونَ فِی سَبِیلِ اللّٰہِ ۔ "اے ایمان والو کیا تمہیں ایک ایسی تجارت بتاؤں جو تمہیں اذیت دینے والے عذاب سے نجات عطا کرے۔ خدا اور رسولؐ پر ایمان لے آؤ اور خدا کی راہ میں جہاد کرو"

سورہ فاطر میں ارشاد ہوتا ہے (۱)

" **اِنَّ الَّذینَ یَتْلُونَ کِتابَ اللّٰہِ وَاَقامُوا الصَّلٰوۃَ وَانفَقُوا مِمَّا رَزَقْناھُم سِرّاً وَعَلانِیَۃً یَرجُونَ تِجارَۃً لَنْ تَبُورَ** "

یہ لوگ ایسی تجارت کے نتیجے کے امیدوار ہیں جس میں نقصان نہیں ہو سکتا۔"

بیعت کی قسمیں

ایسی بہت سی مثالیں قرآن میں ہیں مگر اس نکتے کی طرف بھی توجہ کرنی چاہئیے کہ جب مثال دی جاتی ہے یا کسی چیز کو دوسری چیز سے تشبیہ دیجاتی ہے تو وہ دونوں چیزیں (یعنی مُشبَّہ اور مُشبہ بہ) ضروری نہیں کہ تمام باتوں میں ایک جیسی ہوں۔ دراصل بعض اہم باتوں میں مشابہت کا ذکر ہوتا ہے۔ مثلاً قرآن میں تقویٰ (یعنی پرہیزگاری) کو لباس کہا گیا ہے۔ اللہ فرماتا ہے۔ "**وَلِباسُ التَّقوٰی**"

(۱) آیت نمبر ۲۹۔ "جو لوگ اللہ کی کتاب پڑھتے ہیں، نماز ادا کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انہیں عطا کیا ہے اس میں سے پوشیدہ اور علانیہ خیرات کرتے ہیں۔ وہ ایسی تجارت میں مصروف ہیں جس میں کبھی نقصان نہیں ہو گا"

ذٰلِكَ خَيْرٌ "(۱) اور لباس تقویٰ سب سے بہتر ہے اسی طرح خدا نے بیوی کو شوہر کے لئے لباس اور شوہر کو بیوی کے لئے لباس سے تشبیہ دی ہے۔ " هُنَّ لِبَاسٌ لَكُمْ وَاَنْتُم لِبَاسٌ لَهُنَّ "(۲) ایک جگہ غیبت کرنے کو مرے ہوئے لوگوں کا گوشت کھانے سے تشبیہ دی ہے۔ " اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَاكُل لَحْمَ اَخِيهِ مَيْتاً " فَكَرِهْتُمُوهُ "(۳)

بیعت کو جو تجارت اور باہمی سودے کا نام دیا گیا اُسے بے معنی نہ سمجھنا چاہیئے مگر افسوس جیسا کہ آگے ذکر آئیگا بیعت کو وفاداری کا حلف اٹھانے سے تعبیر کر دیا گیا۔

مکے کے جو مسلمان حضور کی صحبت سے فیضیاب ہو کر ایمان لائے تھے انہیں اس وقت اسلام کی معنوی تعلیم دی جارہی تھی کیونکہ پیغمبر نے ابھی کسی حکومت کی بنیاد نہ رکھی تھی۔ جو مسلمان ہوئے انہوں نے پیغمبر کی نبوت کو تسلیم کیا تھا چنانچہ اس دوران ان نازل ہوئی قرآن کی اکثر آیات میں ایمان لانے والوں کا ذکر "مومن" اور "مسلم" دو ناموں سے کیا گیا ہے۔ لیکن جیسے ہی پیغمبر مدینہ تشریف لے گئے اور ہاں حکومت بنائی تو بہت سے لوگوں نے (جن میں منافق بھی تھے) ظاہری طور پر انکی حکومت تو تسلیم کر لی مگر دل سے مسلمان نہیں ہوئے۔

---

(۱) سورہ اعراف آیت نمبر۔ ۲۶ (۲) سورہ بقر۔ آیت نمبر۔ ۱۸۷ (۳) سورۂ حجرات۔ آیت۔ ۱۲ "کیا تم سے کوئی اسے پسند کرے گا کہ اپنے مرحوم بھائی کا گوشت کھائے یقیناً تم اسے ہرگز پسند نہ کرو گے"

درحقیقت پیغمبر نے مدینے میں جو بیعت لی تھی وہ مکے کی بیعت سے مختلف تھی۔ یعنی مدینے میں دو قسم کی بیعت تھی

(الف) بیعت نبوت

اس بیعت کے ذریعہ وہ شخص بھی اسلامی حکومت کو قبول کر لیتا تھا جو اسلام پر قوی اعتقاد نہ رکھتا ہو۔ مثلاً جو شخص نماز نہ پڑھتا ہو یا روزہ نہ رکھتا ہو وہ بھی حکومت کو تسلیم کر لیتا تھا۔ یعنی آج کل کی زبان میں وہ شہریت حاصل کرنے کے تقاضے پورے کر دیتا تھا۔ ایسے لوگوں کی بیعت کا پیغمبر کی جانب سے قبول کر لینے کا مطلب بھی نئے مسلمانوں کو اسلامی حکومت کی شہریت عطا کرنا تھا یہ بیعت نبوت تھی۔ اسکی رو سے بیعت کرنے والا مسلمانوں کے یہاں شادی کر سکتا تھا اور انکی وراثت بھی حاصل کر سکتا تھا۔ پیغمبر کے زمانے میں بیعت کے بغیر کوئی اسلام میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ فتح مکہ کے بعد ہندۂ جگر خوار کو بھی بیعت کرنی پڑی تھی۔

(ب) بیعت ولایت

دوسری بیعت ایمانی تھی۔ یہ اسلامی بیعت سے الگ تھی یہ درحقیقت پیغمبر کی ولایت کی بیعت تھی۔ یعنی جو لوگ مکے یا مدینے میں پیغمبر کی نبوت تسلیم کر چکے تھے (جس میں لازم تھا کہ پیغمبر کی حکومت کو بھی تسلیم کیا جائے) اس بیعت

ولایت کے ذریعے اہل ایمان میں داخل ہو جاتے تھے۔ پیغمبر کے زمانے میں ہی ایک گروہ پیغمبر کی نبوت کو ہی اصل قرار دیتا تھا۔

ان کا خیال تھا کہ بیعت اسلام ہی ایمان لانا ہے۔ اللہ سورۂ حجرات میں فرماتا ہے۔

" قَالَتِ الأعرَابُ آمنّا قُل لَم تُومِنُوا وَلَكِن قُولُوا اَسلَمنا وَلَمّا يَدخُلِ الأيمانُ فِي قُلُوبِكُم "(۱)

بلکہ یوں کہو ہم تسلیم ہو گئے۔ اسلام لے آئے۔ سچ تو یہ ہے ایمان ابھی تمہارے دلوں میں داخل ہی نہیں ہوا۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اسلام اور ایمان دو الگ الگ باتیں ہیں اسلام لانے کا مطلب اللہ اور رسول کا زبانی اقرار اور حکومت تسلیم کرنے کی گواہی دینا ہے۔ مگر ایمان کا تعلق قلب سے ہے۔ چنانچہ پیغمبر سے خطاب کرتے ہوئے آیت نمبر ۱۷ میں خدا فرماتا ہے۔ " **يَمُنُّونَ عَلَيكَ اَن اَسلَمُوا قُل لَا تَمُنُّوا عَلَيَّ اِسلَامَكُم بَلِ اللّهُ يَمُنُّ عَلَيكُم اَن هَداكُم لِلأيمَانِ اِن كُنتُم صَادِقِينَ (۲)**" یعنی اے پیغمبر یہ لوگ تجھ پر احسان جتاتے ہیں کہ انہوں نے اسلام قبول کر لیا۔ تو ان سے کہہ دے کہ تم مجھ پر اپنے اسلام لانے کا احسان نہ جتاؤ بلکہ یہ تم پر خدا کا احسان ہے کہ اسلام لانے کی بدولت اس نے ایمان کی طرف تمہاری رہنمائی کی ہے۔"

(۱) سورۂ حجرات۔ آیت۔ ۱۴ (۲) سورۂ حجرات۔ آیت ۱۷

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام ایمان کا پہلا درجہ ہے یعنی ایمان اسلام کے بغیر ممکن نہیں مگر ایمان کے بغیر اسلام ہو سکتا ہے اسی آیت کے آخر میں اللہ فرماتا ہے **اِن كُنتُم صَادِقِينَ**۔ یعنی اگر تم اسلام لانے میں سچے ہو تو اپنی بات پر قائم رہو یہ نہ ہو کہ حکومت کے خوف سے تم نے اسلام قبول کر لیا ہو۔

ان توضیحات کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ پیغمبر کے زمانے میں بیعت ایمانی اور بیعت حکومتی الگ الگ تھی پیغمبر کی رحلت کے بعد بیعت ایمانی علیؑ کی ولایت کے لئے تھی۔ خلفائے راشدین میں سے کسی نے بھی ایسی بیعت لینے کا دعوی نہیں کیا۔

اُموی اور عباسی اپنی خلافت کے دوران ان دو بیعتوں کا فرق نہیں سمجھ سکے۔ غالباً ان کا ایمان کمزور تھا۔ اسی بناء پر وہ یہ تصور کرنے لگے کہ بیعت صرف حکومت کے لئے ہوتی ہے (۱) چنانچہ جب انہیں معلوم ہو جاتا تھا کہ ہمارے امام بھی بیعت لے رہے ہیں تو وہ ان کی جان کے دشمن بن جاتے تھے۔

(۱) عموماً قدیم زمانے سے بیعت حکومت کے لئے لی جاتی تھی چنانچہ خلفاء بیعت لیتے تھے۔ یہ بیعت صرف انکی خلافت کے لئے ہوتی تھی۔ اس میں بیعت کرنے والا یہ عہد کرتا تھا کہ وہ حکومت کی اطاعت اور اسکے قوانین پر عمل کریگا حکومت بھی اسکے جان و مال کے تحفظ کی ضمانت دیتی تھی۔ ایک جنگ میں جب ملک شام کے کچھ علاقوں پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا تو بہت سے لوگ بیعت کر کے مسلمان ہو گئے۔ مسلمان ہونے والے خمس اور زکواۃ دیتے تھے۔ حکومت مسلمانوں اور جزیہ دینے والوں سب کی جان و مال کی حفاظت کی ذمے دار تھی۔ کچھ ہی دن بعد رومی فوجوں نے مسلمانوں کے جیتے ہوئے علاقوں پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ اسلامی لشکر نے بھی جنگ کے بعد پھر ان علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ اس وقت شہریوں کو خمس، زکواۃ اور جزیے کی رقم اس لئے لوٹا دی گئی کہ حکومت انکی جان و مال کا تحفظ نہ کر سکی تھی۔ اس واقعے سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ بیعت حکومت کے لئے لی گئی تھی۔

ائمہ اطہار کے زمانے میں بیعت ایمانی کا سلسلہ جاری تھا۔

ائمہؑ نے اپنی طرف سے کچھ لوگوں کو بیعت لینے کی اجازت دے رکھی تھی چنانچہ حضرت سجادؑ نے اپنے چچا محمد حنفیہ کو اختیار دیا تھا کہ انکی طرف سے بیعت لیں۔ یہ عمل تمام اماموں کے زمانے میں جاری رہا۔ امام مومنین کے لئے بیعت ایمانی واجب سمجھتے تھے۔ چنانچہ اپنے نمائندوں کے ذریعہ خفیہ طور پر بیعت لیا کرتے تھے۔

واضح ہو گیا کہ اسلام میں بیعت کو شرعی حثییت حاصل ہے عورتوں کی بیعت کے بارے میں خدا فرماتا ہے " اِذَا جَاءَ كَ الْمُومِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ " (۱) اور گذشتہ آیت ان اللہ اشتری "(۲) میں آیا ہے کہ یہ بیعت دینی احکام پر عمل آوری اور جان و مال کی خریدی کے لئے ہے نہ کہ جنگ و جہاد کے لئے جیسا کہ کچھ لوگوں کا خیال ہے کیونکہ جہاد عورتوں کے لئے ممنوع ہے البتہ بیعت کا حکم جاری ہے (تاریخ بتاتی ہے کہ جنہیں بیعت ایمانی سے دلچسپی نہ تھی وہ اسلامی بیعت یا حکومت کی بیعت لے لیا کرتے تھے۔) اسکے منسوخ ہونے کے بارے میں کوئی حکم نہیں ملتالہذا حکم بیعت آج بھی جاری ہے۔

اماموں کے زمانے میں وہ خود یا انکے نمائندے بیعت لیا کرتے تھے۔ بارھویں

(۱) سورۂ ممتحنہ۔ آیت۔ ۱۲ "اگر مومن عورتیں تمہارے پاس بیعت کے لئے آئیں"
(۲) سورۂ توبہ۔ آیت۔ ۱۱۱

امام کے زمانے میں چار وکیلوں (یا چار نائبوں) کی موجودگی میں خصوصیت یہ تھی کہ شیعوں سے امام کا ربط بر قرار رہے کیونکہ ان وکیلوں کو امام کی قیامگاہ کا علم تھا۔ یہ وکلاء شیعوں کی عرضیاں امام تک اور ان کا جواب عرضی بھیجنے والوں کو پہونچاتے تھے۔ یہ لوگ بذات خود بیعت لینے کے مدعی نہ تھے نہ کتابوں میں لکھا ہے کہ وہ بیعت لیا کرتے تھے اس زمانے میں اسکی اجازت شیخ جنید بغدادی کو حاصل تھی۔

بیعت دوران غیبت

حقیقت یہ ہے کہ حضرت امام رضاؑ کے بعد شیعوں پر ظلم بڑھ گئے تھے۔(۱) خود حضرت رضا نے اپنے دربان معروف کرخی کو بیعت لینے کی اجازت دے رکھی تھی اور اسکا اختیار بھی دیا تھا کہ وہ جس کو لائق سمجھیں امام کو مطلع کرتے ہوئے اُنکی اجازت سے انکا جانشین مقرر کریں۔

معروف کرخی نے امام کی اجازت سے سری سقطی کو مقرر کیا۔ خود سری سقطی کو بھی یہ اختیار حاصل تھا۔ انہوں نے جنید بغدادی کو مقرر کیا اور وہ بھی بارھویں امام کے زمانے میں یہی اختیار رکھتے تھے۔ غیبت کے بعد بھی امام نے انہیں اپنا جانشین

(۱) اس ظلم کی شدت کا ذکر کتاب "مفاتیح الجنان" میں ہے اس مقام پر جہاں ہفتے بھر کے نام ائمہ ھدیٰ کے نام سے موسوم کئے گئے ہیں۔ وہیں ایک تفصیلی داستان ایک شیعہ نے حضرت علی نقی سے نقل کی ہے۔ ملاحظہ ہو کتاب "مفاتیح الجنان۔ ترجمہ از مہدی الہی قمشہ ای۔ انتشارات علمی۔ تہران۔ ۱۳۴۲۔ صفحہ۔ ۹۵۔۹۶

مقرر کرنے کی اجازت دیدی تھی لہذا انہوں نے اپنا جانشین مقرر کر دیا ۔اس طرح ایمانی بیعت کا سلسلہ جاری رہا۔ درحقیقت جنید کے جانشین امام کے غیر مستقیم نمائندے تھے جو بیعت لیتے تھے ۔ تمام سلسلوں اور اجازت کے سبھی رشتوں کو اصطلاحاً سلسلہ اولیاء اور سلسلہ تصوف کہا جاتا ہے۔ کہنے کو تو بہت سے سلسلے ہیں جو امام سے اپنی نسبت کا دعوی کرتے ہیں۔ اس لئے شیعوں کے نزدیک اس معاملے میں گہری چھان بین اور تحقیق کی جاتی ہے کیونکہ جو سلسلے دست بدست امام تک نہیں پہونچتے انکے اجازت کے رشتوں میں خلل ہوتا ہے۔ یہ معلوم کرنا بہت ضروری ہے کہ ایسا کونسا سلسلہ ہے جسکے اجازت کے رشتوں میں کہیں خلل واقع نہ ہوا ہو۔ جو لوگ اس نظریے سے اتفاق کرتے ہیں ان پر لازم ہے کہ وہ جس سلسلے سے تعلق رکھتے ہوں اسکے بارے میں تحقیق اور جانچ کریں کہ کونسا سلسلہ اٹوٹ ہے اور بغیر کسی خلل کے امام تک پہنچتا ہے۔ جن سلسلوں کا براہ راست امام تک پہنچنا مشکوک ہو اس سے خبردار رہیں۔

بیعت لینے کے طریقے

بیعت لینے کے اسلامی طریقے میں ہاتھ ملایا جاتا تھا جو اب بھی جاری ہے ہر بیعت اور معاملت میں دونوں فریق ہاتھ ملاتے ہیں۔ عورتوں کے معاملے میں کپڑے سے ہاتھ کا ڈھکا ہونا ضروری تھا یا پھر پانی کے کٹورے یا تسبیح کے ذریعے اس طرح بیعت لی جاتی کہ براہِ راست عورتوں کا ہاتھ نہ چھونا پڑے۔ ایمانی بیعت

میں دونوں ہاتھوں کے ملنے کا طریقہ الگ ہے۔ اللہ فرماتا ہے۔ "یَدُاللهِ فَوْقَ اَیْدِیهِم"(۱) "خدا کا ہاتھ انکے ہاتھ کے اوپر ہے"

پیغمبر سے خطاب ہوتا ہے کہ تم سے جو لوگ بیعت کر رہے ہیں انہوں نے دراصل خدا سے بیعت کی ہے۔" اِنَّ الَّذِینَ یُبَایِعُونَكَ اِنَّما یُبَایِعُونَ اللهَ ۔"(۲)

ظاہر ہے خدا نہ کوئی مادی چیز ہے نہ جسم رکھتا ہے کہ اس سے براہ راست بیعت کی جا سکے۔ وہ اپنے بھیجے ہوئے پیغمبر اور وصی کے ذریعے بیعت لیتا ہے۔ اسی بناء پر وہ فرماتا ہے کہ وہ دو ہاتھ جو بیعت کے لئے مل رہے ہیں اس میں خدا کا ہاتھ بھی موجود ہے۔" تمہارے ہاتھ کے اوپر خدا کا ہاتھ ہے" کا مطلب یہی ہے۔

بعض یورپی محققین کی غلطیاں

اسلام سے پہلے ایمانی بیعت اللہ کے ہر دین میں رائج تھی۔ ہر زمانے میں اسکا طریقہ الگ تھا۔ مثلاً جب عیسیٰ تعمید (۳) حاصل کرنے کے لئے۔ یحییٰ سے ملنے گئے چونکہ یحییٰ اچھی طرح واقف تھے کہ آئندہ عیسیٰ کو کس قدر بلند مقامات حاصل ہونے والے ہیں اس لئے انہوں نے فرمایا کہ دراصل مجھے تم سے تعمید حاصل کرنا چاہئیے۔ عیسیٰ نے جواب دیا نہیں اس زمانے کا تقاضا یہی ہے چنانچہ میں تم سے تعمید حاصل کروں گا۔ بہر حال عیسیٰ نے تعمید حاصل کی اور ریاضت کے بعد پیغمبری کے درجے کو پہنچ گئے۔ کچھ لوگ ایمانی بیعت کو تسلیم نہیں کرتے اور

(۱) اور (۲) سورۂ فتح۔آیت۔۱۰

(۳) تعمید۔عیسائی مذہب کا طریقہ ہے جسے انگریزی میں BAPTISM کہتے ہیں (مترجم)

صرف حکومتی بیعت کو تسلیم کرتے ہیں جو عملاً ختم ہو چکی ہے ایسے لوگ اب سرے سے بیعت ہی کو نہیں مانتے۔ دوسرا نکتہ یہ کہ خرید و فروخت کا مفہوم رکھنے والی بیعت انکی سمجھ میں نہیں آتی جو ایک ایسا ایمانی معاہدہ ہے جس میں انسان جنت کے بدلے خدا کے ہاتھوں اپنی جان اور مال فروخت کر دیتا ہے۔ یہ مفہوم اسلام شناسی میں مشغول مغربی محققین کے ذہنوں پر گراں گزرتا ہے۔ اسی بناء پر قرآن کا ترجمہ کرنے والے بیعت کے مذکورہ بالا مفہوم کو ناپسند کرتے ہوئے جان بوجھ کر اسکا ترجمہ "وفاداری کی قسم کھانا یا عہد کرنا" کرتے ہیں۔ مثلاً بلاشر (۱) ایڈورڈ مونیٹ (۲) نے فرانسیسی میں قرآن کا ترجمہ "وفاداری کی قسم کھانا" کیا ہے حالانکہ قسم ایک طرفہ ہوتی ہے اور بیعت دو طرفہ۔ قرآن میں پیغمبر سے ایک جگہ یوں خطاب کیا گیا ہے۔ "**یٰا اَیُّھَاالنَّبِیُّ اِذٰا جٰائَكَ الْمُومِنٰاتُ یُبٰایِعْنَكَ ۔۔۔ فَبٰا یِعْھُنَّ وَاسْتَغْفِرلَھُنَّ اللّٰهَ** " (۳) "جب مومن عورتیں تمہارے پاس بیعت کے لئے آئیں ۔۔۔ تو بیعت کر لو اور خدا سے انکے لئے مغفرت طلب کرو۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ بیعت میں بھی ایک ذمہ داری ہوتی ہے۔ اس غلطی کا سبب بیعت کے حقیقی مطلب سے غفلت اور عرفان کے گہرے مطالعے سے ناواقفیت ہے۔ پروفیسر حمید اللہ بھی بیعت کا ترجمہ "وفاداری کی قسم" کرتے ہیں" (Jures Fidelite)"۔ انگریزی میں ترجمہ کرنے والوں نے بھی یہی غلطی کی ہے۔ آربری (۴) (To Swear Fealty) پکتھال (۵) (Plight One's Fealty) اور یوسف علی (To Swear Allegiance) ترجمہ

(۱) Blachere Regis (۲) Montet Edward (۳) سورۂ ممتحنہ۔ آیت۔ ۱۲
(۴) ARBERRY (۵) PIKTHAL

کرتے ہیں ان سب کا مطلب کم و بیش وفاداری کی قسم ہے۔

حال میں کچھ کتابوں میں بیعت کا ترجمہ (Initiation) کیا گیا ہے (۱) حالانکہ اس کے معنی رسم ادا کرنے اور آداب بجالانے کے ہیں۔ بیعت کے ایک دو پہلوؤں پر اسکا اطلاق ہو سکتا ہے (جیسے جسم اور لباس کی طہارت وغیرہ) مگر اس سے بیعت کا مفہوم مکمل طور پر واضح نہیں ہوتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ لفظ بیعت اور ولایت کے لئے مغربی زبانوں میں کوئی مترادف لفظ نہیں ہے لہذا ان میں ترجمہ کرتے وقت "بیعت اور ولایت" ہی استعمال کرنا چاہئے۔

(۱) لغت نامہ 'لاروس' میں اسکی دو تعریفیں دی گئی ہیں
INITIATION قدیم مذہبوں میں کچھ رسمیں تھیں جنہیں انجام دینے پر کوئی شخص پوشیدہ راز جاننے کے لائق ہو جاتا تھا پوشیدہ رازوں کی انجمنوں کی رکنیت حاصل کرنے کے لئے آج بھی کسی شخص کو اس قسم کی رسومات ادا کرنی پڑتی ہیں۔
ایک ایسا عمل جس کے ذریعے کسی چیز کا علم ایک ایسے شخص کو ہو جاتا ہے جس سے وہ بے خبر تھا۔
مندرجہ بالا مفہوم پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ لفظ Initiation کا مطلب تشرّف (یعنی مراسم) ہے نہ کہ بیعت۔

بیانیہ (۱)

ھو

۱۲۱

بہ نام خداوند جان آفرین ☆☆ حکیم سخن در زبان آفرین

عزیز بھائیو!

ہم سب بزرگ محترم حضرت محبوب علی شاہ کی وفات پر سوگوار ہیں خدا ہمیں انکے درد جدائی کو برداشت کرنے کی توفیق اور صبر عطا فرمائے اور انکی روح کو ہم سے راضی اور خوش رکھے۔ خدا سے دعا ہے کہ مجھ ناچیز کو ان فرائض کے انجام دینے کا حوصلہ بخشے جو بزرگوار محترم کی رحلت سے مجھ پر عائد ہو گئے ہیں۔ بارگاہ الٰہی میں میری یہ التجا قبول ہو جائے اسکے لئے آپ سب دعا کریں۔

وہ دستور العمل جو "پند صالح" اور تختیوں میں تحریر ہے جسے مجھ ناچیز سے پہلے گزرنے والے بزرگوں نے ترتیب دیا تھا۔ اُسے آپ مسلسل پڑھتے رہیں، یاد رکھیں اور اس پر عمل کریں۔ اس سے آپ کو خدا کی خوشنودی اور مجھ حقیر کو توفیق حاصل ہو جائیگی۔ یہاں اسمیں سے میں چند نکتے دہراتا ہوں۔

ا۔ سماجی اور انفرادی زندگی میں عفت باقی رہے اسکے لئے عورتوں پر اسلامی حجاب (پردے کی) اور مردوں کے لئے تقویٰ (یعنی پرہیزگاری) کی پابندی لازم ہے

(۱) یہ بیانیہ جو دراصل فقرای نعمۃ اللّٰہی سلطان علیشاہی کے لئے ایک دستور العمل ہے' قطب العارفین حضرت محبوب علیشاہ کی وفات پر جاری کیا گیا۔

۲۔ آپ سب اچھی طرح جانتے ہیں کہ سو سال پہلے حضرت سلطان علیشاہ شہید نے نشہ لانے والی چیزوں کے استعمال سے روک دیا تھا۔ یہاں تک کہ نشے کے عادی لوگوں کی انہوں نے دستگیری بھی نہیں کی۔ ان کے جانشینوں نے بھی بار بار اسکی تاکید کرتے ہوئے یہی عمل جاری رکھا۔ خدانخواستہ آپ کے بھائی بہنوں میں سے اگر کوئی نشے کا ذرا سا بھی عادی ہو تو اسے چاہئیے کہ بارگاہ الٰہی میں توبہ کرے اور دعا مانگے کہ خدا اُسے اس عادت کو چھوڑنے کی توفیق دعا کرے۔ اس قسم کی عادتیں خطرناک اور عقل کو زائل کرنے والی ہوتی ہیں اور جب تک توبہ قبول نہ ہو اور عادت چھوٹ نہ جائے فقراء کی مجلسوں میں شرکت نہ کرے قرآن میں اللہ فرماتا ہے "وَلاَ تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰارٰى "(۱) اس حکم پر عمل کرتے ہوئے بہت کم اور ایسے وقت شرکت کرے جبکہ وہ نشے میں نہ ہو۔

۳) بزرگ عارفوں نے شرعی طور پر مقررہ فرائض کو ضمنی طور پر تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

(الف) احکام شریعت میں کامل ترین مجتہد کی پیروی کرنی چاہئیے۔ ایسی ہستی کو تلاش کرنا آپ کی ذمے داری ہے۔

(ب) احکام طریقت کا علم اپنے عہد کی بزرگ ترین ہستی سے حاصل کرنا چاہئیے۔ عرفانی تربیت کے طریقے بڑے بڑے عارفوں کی کتابوں میں ہیں۔

(۱) سورہ نساء۔ آیت۔ ۴۳۔ "نشے کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ۔"

(ج) شخصی معاملات میں ہر شخص کو اختیار ہے کہ وہ حق تعالیٰ کی عطا کی ہوئی صلاحیتوں سے استفادہ کرتے ہوئے فیصلہ کرے۔ عارفین کی ہدایت ہے کہ لوگ شریعت اور طریقت کے مسائل چھوڑ کر باقی معاملات میں اپنی شرعی فکر و تدبیر کے مطابق رہنمائی حاصل کریں۔

۴۔ سماجی اور معاشرتی مسائل میں کسی قسم کی مداخلت اور اظہار خیال بزرگان طریقت کا شیوہ نہیں۔ فقراء اس بات کی توقع نہ رکھیں کہ ان معاملات میں انہیں بزرگوں سے کوئی رہنمائی یا ہدایت حاصل ہو گی۔ اس سلسلے میں اپنی نیت اور عمل خالصتاً اللہ کی طرف رکھیں۔ اپنی ذمے داریوں اور فرائض کا خود تعین کریں۔ بزرگ ان معاملات میں کبھی اظہار خیال نہیں کرتے تھے تاکہ کوئی اس مغالطے میں نہ رہے کہ یہ باتیں بھی طریقت کے دائرہ کار میں آتی ہیں لہذا سماجی اور معاشرتی امور میں عدم مداخلت کی یہی روش برقرار رکھی جائے۔

۵۔ سماجی اور معاشرتی نظم و ضبط پر عمل اور قانون کا احترام ہمیں سقراط سے سیکھنا چاہئیے۔ سوسائیٹی کے قوانین پر عمل کرنا دراصل اپنا اور دوسروں کا احترام کرنا ہے۔ اس بات کا خاص خیال رکھنا چاہئیے۔

دعا کا طلبگار

نور علی تابندہ مجذوب علیشاہ

۷ رمضان ۱۴۱۷ ہجری مطابق ۲۸ دی ۱۳۷۵ شمسی